گورنمنٹ اور آریوں سے خطاب

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ - ھُوَالنَّاصِرُ

میرا ۲۷۔ مارچ کا خطبہ

حصہ اول

گورنمنٹ اور آریوں سے خطاب

میرے ۲۷۔ مارچ کے خطبہ کے شائع ہونے پر اپنوں اور بیگانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور علاوہ اس کے کہ مختلف قسم کے خطوط میرے پاس آ رہے ہیں آریہ اخبارات بھی اس پر بہت کچھ ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق کسی قدر اور تشریح کر دوں تا کہ دوست اور دشمن دونوں کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے اور کوئی شخص دھوکے میں نہ رہے۔

میرا نقطۂ نگاہ سمجھ لیا جائے

سب سے پہلے تو میں آریہ اخبارات اور حکومت کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کسی قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے میرا نقطۂ نگاہ اچھی طرح سمجھ لیں تا کہ کسی بے اصولے پن کا ارتکاب آخر انہیں شرمندہ نہ کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس قدر عمر پبلک کے سامنے گزاری ہے کہ حکومت بھی اور ابنائے وطن بھی اس امر کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ میں جلد بازی سے قدم اٹھانے کا عادی نہیں ہوں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے سوچ کر اور غور اور فکر کے بعد میں فیصلہ کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل

سے اِس وقت تک سترہ سالہ پبلک زندگی میں ایک دفعہ بھی مجھے شرمندہ ہونے کا موقع پیش نہیں آیا اور مجھے اپنے فیصلہ کے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور جلد یا بدیر لوگوں کو میرے نقطۂ نگاہ کی صحت تسلیم کرنی پڑی ہے۔ اپنے علم اور اپنے تجربہ کو دیکھتے ہوئے میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوا ہے ورنہ چونکہ میری صحت خراب ہے اس کے اثر کے نیچے بالکل ممکن تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو میری تقریر اور تحریر میں جلدبازی اور چڑ چڑے پن کا اثر پایا جاتا۔ بہرحال دوست اور دشمن اس امر کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ میں محتاط آدمی ہوں اور اندھادُھند اعلان کرنے کا عادی نہیں حتّٰی کہ بعض دوست مجھ پر کمزوری کا الزام لگاتے ہیں۔ پس حکومت اور دشمنانِ اسلام کو میں اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے نقطۂ نگاہ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جو یہ ہے۔

بَیْنَ الْاَقْوَام معاملات میں حکومت کا رویہ

میرا خطبہ بیان کردہ ۲۷۔ مارچ ۱۹۳۱ء اس امر کے متعلق ہے کہ حکومت کا رویہ بین الاقوامی معاملات میں انصاف پر مبنی نہیں بلکہ ضرورت وقتی پر مبنی ہے اور یہ بات نہایت قابلِ افسوس ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کو مصلحتِ وقت کے مطابق کام کرنا ایک حد تک ضروری ہوتا ہے لیکن یہ اُسی وقت تک جائز ہے جب تک کہ کسی قوم یا فرد پر ظلم نہ ہوتا ہو۔ جب کسی فعل سے کسی فرد یا قوم پر ظلم ہوتا ہو تو ایسا فعل مصلحت وقت کے ماتحت نہیں بلکہ سیاسی پالیسی کے ماتحت کہلائے گا اور مجھے افسوس ہے کہ بین الاقوام معاملات میں گورنمنٹ کا رویہ دلیرانہ اور منصفانہ نہیں بلکہ سیاسی پالیسی کے ماتحت ہوتا ہے۔ جو قوم زیادہ شور مچائے اور گورنمنٹ کو زیادہ تنگ کر سکے گورنمنٹ اس کے ساتھ مل جاتی ہے۔ آریہ لوگ پنجاب میں زیادہ شور مچاتے ہیں اور حکومت ہمیشہ ان سے دبتی ہے اور اِس وقت حکومت کے دفاتر اور اس کی پالیسی پر وہی قابض ہیں۔ کانگریس نے شور مچایا اور حکومت اس کے آگے اس قدر گری کہ اس کے ساتھ تعاون کرنے والے لوگ اپنے دلوں میں شرمندگی اور ذلّت محسوس کرتے ہیں۔

انگریزوں کی خوبیاں

میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور اب تک ہے کہ انگریزوں میں بہت سی خوبیاں ہیں اور ان کی وجہ سے میں ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ انگریز ابھی اس ملک میں بہت سے مفید کام کریں گے اور

ہندوستان ابھی پوری طرح ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

انگریز اپنے دوستوں کا حلقہ تنگ کر رہے ہیں

لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ انگریزی حکومت کی مذکورہ بالا کمزوری اس کے دوستوں کا حلقہ روز بروز تنگ کرتی جاتی ہے اور اگر حکومت نے وقت پر اپنی اصلاح نہ کی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ ہر ایک قوم ان سے تاجرانہ یا خود غرضانہ تعلق رکھے گی۔ انگریز کی دوستی اور اس سے مخلصانہ تعلق رکھنے والا ایک فردِ بشر بھی نہ ہو گا اور اس تغیر کی ذمہ واری حکومت پر اور صرف حکومت پر ہو گی۔

مذبح قادیان کا معاملہ

میں اپنے ہی سلسلہ کی مثال لیتا ہوں۔ قادیان کا مذبح گرایا گیا اور ایسے حالات میں گرایا گیا کہ کوئی انصاف پسند انسان اس کو جائز نہیں قرار دے سکتا۔ ایک طرف ظلم، تعدّی، بغاوت اور شرارت کا مظاہرہ تھا تو دوسری طرف نرمی، عفو، امن پسندی اور شرافت کا مظاہرہ تھا۔ پولیس کی موجودگی میں مذبح گرایا گیا۔ ایک سب انسپکٹر اور کئی کانسٹیبل وہاں موجود تھے انہوں نے ان حملہ آوروں کو روکا نہیں بلکہ کھڑے دیکھتے رہے اور پھر مقدمہ میں ایک شخص بھی مجرموں میں سے اپنے کیفرِ کردار کو نہیں پہنچا۔ دوسری طرف احمدیوں نے نہایت بُردباری اور امن پسندی کا ثبوت دیا اور باوجود طاقت کے اس خوف کی وجہ سے ان شریروں کا مقابلہ نہ کیا کہ کہیں وہ امن شکنی کا موجب نہ ہو جائیں اور اسی یقین کی وجہ سے ہاتھ نہ اٹھایا کہ حکومت ان مفسدوں کو خود سزا دے گی لیکن ان کا اعتماد بے محل ثابت ہوا۔ حکومت نے ایک مفسد کو بھی سزا نہیں دی۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتا کہ علاقہ کے تھانہ دار اور پولیس کی موجودگی میں ایک مجرم کی بھی شناخت صحیح طور پر نہ ہو سکی ہو۔ پس سب مجرموں کا چُھٹ جانا بتاتا ہے کہ یا تو اصل مجرموں کو پکڑا ہی نہ گیا تھا۔ یا یہ کہ مقدمہ کو جان بوجھ کر اس طرح چلایا گیا تھا کہ وہ لوگ بری ہو جائیں تا کہ دنیا یہ خیال کر لے کہ گورنمنٹ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور سکھ بھی گورنمنٹ سے ناراض نہ ہوں۔ اس وقت ایک ہی سوال حکام کے سامنے تھا اور وہ یہ تھا کہ سکھوں کو دسمبر ۱۹۲۹ء کی کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے سے ہر قیمت پر روکا جائے لیکن اگر حکومت وفادار رعایا کے حقوق کو تلف کر کے اس قسم کی کارروائی کرے تو اسے کب یہ امید ہو سکتی ہے کہ آئندہ مشکلات کے وقت میں اس کی تائید کی جائے گی۔

کانگرس کی شورش کے ایام میں کام مگر میں نے پھر بھی کانگرس کی شورش کے وقت میں ایسا کام کیا ہے کہ کوئی انجمن یا فرد اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ اگر میں اُس وقت الگ رہتا تو یقیناً ملک میں شورش بہت زیادہ ترقی کر جاتی اور یہ صرف میری ہی راہنمائی تھی جس کے نتیجہ میں دوسری اقوام کو بھی جرأت ہوئی اور اُن میں سے کئی کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

ہم نیلام ہونے کے لئے تیار نہیں لیکن باوجود اس کے مذبح کے معاملہ میں حکومت ہمارے احساسات کے ساتھ کھیلتی رہی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر اس معاملہ کو اس قدر لمبا کیا ہے کہ کوئی شخص اسے جائز نہیں قرار دے سکتا۔ وہ ہماری جیبوں سے سکھوں کو عارضی طور پر روکے رکھنے کی قیمت دلوانا چاہتی ہے لیکن ہم نیلام ہونے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ذمہ وار افسر دو سال سے ہمیں یہ کہتے چلے آتے ہیں کہ مذبح کا فیصلہ ہو گیا ہے بس اب جاری ہوتا ہے کچھ دن آپ لوگ اور صبر کریں۔ اپنے حقوق چھوڑ کر بھی سکھوں کو خوش رکھیں تاکہ مذبح کے کھولنے میں دِقّت نہ ہو۔ یہی آواز ہے جو ڈیڑھ سال سے ہمارے کانوں میں پڑ رہی ہے لیکن ہنوز روزِ اول والا معاملہ ہے۔ مذبح ہمارا حق ہے، اس حق کے لینے کے لئے زائد قیمت ادا کرنے کے معنی ہی کیا ہوئے۔

قادیان کی تعزیری چوکی لطف یہ ہے کہ جو تعزیری چوکی بٹھائی گئی ہے علاوہ اس کے کہ اس کا رویہ نہایت قابلِ اعتراض ہے اس کے آنے پر چوریاں بڑھ گئی ہیں اور لوگ شُبہ کرتے ہیں کہ یہ چوریاں خود بعض پولیس کے آدمی اس لئے کروا رہے ہیں تاکہ تعزیری چوکی کی معیاد بڑھائی جا سکے۔ نیت کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قادیان میں پچھلی سردیوں میں اس قدر چوریاں ہوئی ہیں کہ اس سے پہلے کئی سال میں بھی اس قدر نہ ہوئی ہوں گی۔ پس اگر بددیانتی نہیں تو بعض لوکل افسروں کی نالائقی اس سے ضرور ثابت ہوتی ہے۔

تعزیری چوکی کا خرچ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ اس چوکی کا خرچ جو علاقہ پر تقسیم کیا گیا ہے اس میں مسلمانوں پر خاص ظلم کیا گیا ہے حالانکہ قصور سکھوں کا تھا۔ کمین لوگ جو بچارے نہایت محنت سے مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں ان پر بار بہت زیادہ ڈالا گیا ہے اور سکھ زمینداروں پر بہت کم ڈالا گیا ہے۔ یہ ظلم برابر جاری ہے اور باوجود

توجہ دلانے کے اس کی اصلاح نہیں ہوئی۔

گورنمنٹ کا قابلِ تعریف فعل

ہم اس قدر ممنون ضرور ہیں کہ احمدی جماعت کو اس ٹیکس سے بری رکھا گیا ہے اور اسی طرح قادیان کے دوسرے باشندوں کو بھی اور میں اس ناراضگی کے وقت میں بھی گورنمنٹ کے اس فعل کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ امر ایسا تھا جس میں کسی دوسری قوم کی ناراضگی کا سوال نہ تھا اور یہ میں مانتا ہوں کہ جب سیاسی پالیسی کا سوال نہ ہو اُس وقت انگریز افسر ہندوستانی سے زیادہ اعتماد کے قابل ہوتا ہے اور باوجود ان لوگوں کے بُرا منانے کے میں اس خوبی کے اعتراف سے باز نہیں رہ سکتا۔

ہمارا شکوہ

ہمیں اگر شکوہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت جب کہ کسی کثیرالتعداد قوم کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہوتا ہے اس وقت حکومت کے بعض افسران انصاف کی جگہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے حالات کو دیکھنے لگتے ہیں اور اگر کثیرالتعداد لوگ ناراض ہوتے ہوں تو عدل اور انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ امر ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

الفضل کو گورنمنٹ کی تنبیہہ

اسی قسم کی ایک تازہ مثال میں نے اپنے خطبہ میں پیش کی تھی اور وہ یہ کہ آریوں نے ابتداء کر کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ کو لیکھرام کا قاتل لکھا لیکن حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی اور ایسے شخصوں کو کوئی سزا نہیں دی۔ لیکن الفضل نے جب جواب دیا تو اس کو تنبیہہ کی گئی کہ اس میں لیکھرام کے خلاف مضامین کیوں لکھے گئے ہیں اور ایک وجہ تنبیہہ کی یہ بتائی گئی کہ لیکھرام کو لیکھو کیوں لکھا گیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے اپنے خطبہ میں بیان کیا ہے پنڈت لیکھرام کا اصل نام لیکھو ہی تھا۔ پس لیکھو کو لیکھو کہنا کوئی جُرم نہیں تھا۔ لیکن حکومت نے اس پر تو اظہارِ ناراضگی کیا کہ لیکھو کو لیکھو کیوں لکھا ہے اور ان آریہ اخبارات کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی کہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قاتل لکھتے ہیں۔ حالانکہ جب الفضل نے جوابی طور پر آریوں پر حملہ کیا تھا تو حکومت کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے تھا اور اپنے نفس میں شرمندہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم نے وقت پر ان شریروں کی زبان بندی نہیں کی جنہوں نے ایک ایسے شخص پر جو گورنمنٹ کا بھی مُحسن تھا ایسا گندہ الزام لگایا ہے۔

آریوں کی دھمکی کا جواب

میرے اس خطبہ پر حکومت تو نہ معلوم کیا کارروائی کرے لیکن آریہ صاحبان بہت ناراض ہیں اور دھمکی دیتے ہیں کہ اگر لیکھو کو لیکھو لکھا گیا تو وہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مرزو یا غلمو لکھیں گے۔ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ میرا نقطۂ نگاہ پہلے خوب سمجھ لیں۔ میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ:-

(ا) جب آریوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قاتل لکھا تو اپنی گندگی اور شرارت کا ثبوت دیا اور ہمارے پیشوا اور امام کو بلاوجہ گالیاں دیں۔ پس ہمارا حق ہے کہ ہم ان کو اسی رنگ میں جواب دیں اور ابتداء کرنے کے بعد آریوں کو ناراض ہونے کا ہرگز کوئی حق نہیں۔ ہاں وہ اپنی شرارت پر ندامت کا اظہار کریں اور آئندہ کے لئے توبہ کریں تو وہ ہم سے نیک سلوک کی امید رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ گالیوں میں بڑھیں گے تو جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، انہیں ایسے جواب سننے پڑیں گے جو ان کے لئے بہت تلخ ہوں گے اور دنیا بھی انہی پر الزام رکھے گی کیونکہ انہوں نے ظلم کی ابتداء کی ہے۔

ایک اور آریہ اخبار کا بے ہودہ نوٹ

مجھے ایک آریہ اخبار کا یہ نوٹ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ہم نے تو مرزا صاحب کو کچھ بھی بُرا نہیں کہا۔ ہم نے تو صرف انہیں قاتل لکھا ہے اور یہ تو ہر قوم کے آدمیوں کا خیال ہے۔ اول تو یہ امر غلط ہے کہ سب اقوام کے لوگ ایسا سمجھتے ہیں سوائے چند خبیث لوگوں کے سب شریف آدمی یہی سمجھتے ہیں کہ لیکھرام یا اپنے کسی شخص کے ہاتھ سے مارا گیا یا اس کے مارنے والا کوئی بے تعلق شخص تھا جس نے اسے مذہبی جوش میں قتل کر دیا۔ اور جو لوگ زیادہ دلیر ہیں اور لوگوں سے نہیں ڈرتے وہ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یہی کہتے ہیں کہ لیکھرام کے قتل کا واقعہ ایسا ہے کہ اسے الٰہی فعل کے سوا کسی اور امر کے طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

آریہ اخبارات کی دنایت

دوسرے یہ امر ان آریہ اخبارات کی دنایت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کسی کو قاتل کہنا معمولی بات سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس میں کوئی گالی نہیں ہے۔ جب کوئی قوم اخلاق سے عاری ہو جاتی ہے تو نہ صرف یہ کہ اس سے بداخلاقی کے کاموں کا ارتکاب ہوتا ہے بلکہ وہ بداخلاقی کو بداخلاقی بھی

نہیں سمجھتی۔ یہی حال معلوم ہوتا ہے آریوں میں سے ایک گروہ کا ہے کہ وہ ایک مقدس ہستی کو قاتل کہہ کر پھر خیال کرتے ہیں کہ ہم نے گالی نہیں دی۔ گویا کہ وہ اس لفظ کو بہت اچھا سمجھنے لگے ہیں۔ شاید کانپور' بنارس وغیرہ مقامات پر عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے بعد اب وہ اپنی فطرتوں کو تسلی دینے کے لئے اس عیب کو عیب نہ قرار دیتے ہوں لیکن انہیں یاد رہے کہ احمدی اور ہر شریف انسان قتل کو گناہ اور عیب سمجھتا ہے اور اپنے بزرگوں کی نسبت اس لفظ کے استعمال کو گالی قرار دیتا ہے۔ پس جب انہوں نے یہ لفظ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت استعمال کیا اور اب تک کر رہے ہیں تو احمدی جو کچھ شائع کریں گے جوابی ہوگا اور اخلاقی ذمہ داری خود آریوں پر یا حکومت پر ہوگی۔

اعزازی خطاب استعمال کرنے کیلئے مجبور نہیں کیا جاسکتا

(۲) دوسری بات میرے نقطۂ نگاہ کے متعلق انہیں اور حکومت کو یہ یاد رکھنی چاہئے کہ میرے نزدیک حکومت یا کسی قوم کا یہ حق نہیں کہ ہم کسی دوسری قوم کے اعزازی خطاب اس کے افراد کے متعلق استعمال کریں۔ اخلاقی طور پر ہم سے یہ تو امید رکھی جاسکتی ہے کہ ہم ظاہری آداب کو ملحوظ رکھیں لیکن یہ نہیں کہ ہم ان کے خود ساختہ خطابات کو بھی استعمال کیا کریں۔ لالہ منشی رام جی بعد میں سوامی شردھانند بن گئے اب ہم سے یہ تو توقع کی جاسکتی ہے کہ ہم لالہ اور جی کا لفظ ان کے نام کے ساتھ لگائیں یا اور کوئی ادب کا لفظ ان کے نام کے ساتھ بڑھا دیں جو عام گفتگو میں استعمال ہوتا ہو لیکن اس امر پر ہمیں مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ ہم منشی رام کا نام چھوڑ کر انہیں شردھانند لکھا کریں۔ اسی طرح گاندھی جی کو جی کہہ کر یا صاحب کہہ کر پکارنے کی تو ہم سے امید کی جاسکتی ہے اور اخلاقاً ہمیں ایسا کرنا چاہئے لیکن ہم سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ ہم انہیں مہاتما بھی کہیں۔ چنانچہ اسمبلی میں ایک دفعہ ایک گورنمنٹ ممبر نے جب مسٹر گاندھی کہا اور لوگوں نے شور مچایا تو اس نے نہایت زور سے کہا کہ مہاتما میں نہیں کہہ سکتا میں مسٹر ہی کہوں گا اور اسی طرح ایک دفعہ غالباً مسٹر جناح کے ساتھ بھی ہوا۔

غرض عُرفِ عام کے مطابق اخلاقاً ایک دوسرے کے نام کے ساتھ صاحب وغیرہ کے الفاظ لگانے تو ضروری سمجھے جاتے ہیں لیکن ماں باپ کے رکھے ہوئے نام کے سوا دوسرے اختیار کردہ یا عطاء کردہ نام لینے ہرگز ضروری نہیں اور اس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

لیکھو نام والدین نے رکھا

پس میرے نقطۂ نگاہ کے مطابق پنڈت لیکھرام کو لیکھو لکھنا ہرگز خلاف اخلاق نہیں کیونکہ ان کا نام ان کے والدین نے لیکھو ہی رکھا تھا جیسا کہ لالہ منشی رام جی المعروف سوامی شردھانند جی کی تحریر کردہ سوانح عمری سے ظاہر ہے۔ سوامی شردھانند پنڈت لیکھو صاحب سے بڑی حیثیت کے آدمی تھے اور خود ان کی پارٹی کے تھے اور پھر ان کے ہم وطن تھے۔ پس ان کی تحریر کو دشمن کی تحریر نہیں کہا جا سکتا اور ان کی شہادت اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ انہوں نے یہ بات پنڈت لیکھو صاحب کے چچا سے سن کر لکھی ہے۔ پس اب آریہ صاحبان اور حکومت کے لئے اصولاً صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے کہ وہ یہ ثابت کر دیں کہ سوامی شردھانند جی نے جو کچھ لکھا ہے عداوت سے اور جھوٹ لکھا ہے۔ تب بے شک وہ ہم سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ پنڈت لیکھرام کو لیکھرام لکھا کرو اور اگر وہ ایسا ثابت کر دیں تو گورنمنٹ سے پہلے میں الفضل کو تنبیہہ کروں گا۔ لیکن اگر سوامی شردھانند جی نے سچ لکھا ہے اور پنڈت جی کا نام لیکھو ہی تھا تو لیکھو کو لیکھو لکھنے پر وارننگ دینے میں حکومت نے نہایت بے انصافی سے کام لیا ہے اور اس پر شور مچانے والے آریوں نے حماقت سے۔

مسیح موعود کا نام والدین نے کیا رکھا

اب اوپر کی بات کو سمجھ کر آریہ اخبارات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مرزو لکھیں یا **غلمو** یا سندھی جیسا کہ انہوں نے نوٹس دیا ہے۔ لیکن اگر انہیں شرافت انسانی سے کوئی بھی حصہ ملا ہے تو انہیں ثابت کرنا ہو گا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ان کے والد نے غلام احمد نہیں بلکہ مرزو یا **غلمو** رکھا تھا غلام احمد بعد میں انہوں نے خود یا ان کی جماعت نے رکھ لیا۔ اگر وہ یہ ثابت کر دیں گے تو ہمیں ہرگز ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا بلکہ ہم انہیں حق بجانب سمجھیں گے۔

اسلامی بادشاہوں کی ہتک

میں نے اپنے خطبہ میں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ مسلمانوں کے بزرگوں کی طرح مسلمانوں کے بادشاہوں کے خلاف بھی ہندوؤں کا ایک طبقہ خصوصاً آریہ بد کلامی اور دشنام دہی سے کام لیتا رہتا ہے لیکن حکومت اس طرف توجہ نہیں کرتی۔ لیکن اسلامی بادشاہوں کے باغی جو بھگت سنگھ وغیرہ کے طریق پر چلتے رہے ہیں جیسے سیواجی وغیرہ۔ جب بعض اسلامی اخبارات

نے ان کی اصلیت کو بے نقاب کرنا چاہا ہے تو حکومت اس میں دخل دیتی رہی ہے۔ لیکن یہ بے اصولا پن ہے اور اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ حکومت بعض موقعوں پر عدل اور انصاف کے ماتحت نہیں بلکہ ضرورت اور ذاتی اغراض کے ماتحت کام کرتی ہے۔ اگر یہ نہیں تو حکومت اس امر میں امتیاز کر کے دکھاوے کہ کیوں سیواجی کو بُرا کہنے پر وہ قانون کو جُنبش دیتی ہے لیکن اورنگ زیب کو بُرا کہنے پر کچھ نہیں کہتی اور کیوں وہ سیواجی کے خلاف لکھنے والوں پر اظہارِ ناراضگی کرتی ہے جب کہ وہ بھگت سنگھ کی تائید میں جو یقیناً سیواجی سے بڑھ کر حُبِّ وطنی کے جذبہ سے معمور تھا مضمون لکھنے والوں کو ملک کے امن کا برباد کرنے والا قرار دیتی ہے۔

سیواجی اور بھگت سنگھ کا مقابلہ

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر سیواجی اور بھگت سنگھ کا مقابلہ کیا جائے تو بھگت سنگھ یقیناً سیواجی سے زیادہ حُبِّ وطن کے جذبات سے معمور تھا کیونکہ سیواجی کو لوٹ مار کی بھی خواہش تھی جو بھگت سنگھ کو نہ تھی۔ سیواجی کو احتمال تھا کہ اگر میں جیتا تو ملک کا بادشاہ ہو جاؤں گا لیکن بھگت سنگھ جانتا تھا کہ میں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب بھی ہو جاؤں تب بھی حکومت گاندھی جی اور نہرو جی کے قبضہ میں جائے گی اس کے نام صرف شاباش ہی شاباش لکھی جائے گی۔ سیواجی جانتا تھا کہ وہ بھی اورنگ زیب کی طرح تلوار چلا سکتا ہے اور مقابلہ کر کے ہوس نکال سکتا ہے۔ لیکن بھگت سنگھ جانتا تھا کہ اسے چوری چھپے حملہ کرنے کے سوا برسرِپیکار آنے کا موقع میسّر نہیں۔ سیواجی کے پیچھے اس کی قوم کی امداد تھی اور بھگت سنگھ جانتا تھا کہ اس کی قوم کے بُزدل مخفی طور پر شاباش دینے کے سوا اس کی کوئی امداد نہیں کریں گے۔ بلکہ ظاہر میں اس کے فعل سے براءت کا اظہار کرتے رہیں گے۔ سیواجی جانتا تھا کہ مسلم بادشاہ اپنی قدیم روایات کے مطابق اس سے نرمی کا سلوک کرے گا۔ بھگت سنگھ جانتا تھا کہ اسے انگریزی قانون کے ماتحت ایک فوجی کی موت مرنے کا بھی موقع نہیں دیا جائے گا بلکہ ایک مجرم کی موت مرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ سب سے آخر میں یہ کہ سیواجی اُس بادشاہ کے مقابل پر کھڑا ہوا تھا جس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا اور جسے غیر ملکی بادشاہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن بھگت سنگھ ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف کھڑا تھا۔ پس ان سب امتیازوں اور ان کے علاوہ اور بہت سے امتیازوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سیواجی یقیناً بھگت سنگھ سے بہت ادنیٰ تھا اور اگر اس کا فعل

قابلِ تعریف تھا اور اس کے خلاف لکھنا جُرم ہے تو یقیناً بھگت سنگھ کا فعل اس سے سینکڑوں گُنے زیادہ قابلِ تعریف ہے اور اس کے خلاف لکھنا اور بھی جُرم ہے۔

ملک معظّم کے بعض نمائندوں کی غداری

حقیقت یہ ہے کہ ملک معظم کے ان نمائندوں میں سے جو ہندوستان میں مقرر ہیں بعض نے اورنگ زیب کے خلاف مضمون لکھوا کر اور سیواجی کی تعریف کر کے اس اعتماد کو جو ملک معظم نے ان پر کیا تھا غلط ثابت کر دیا ہے اور حکومت برطانیہ سے غداری کی ہے اور فسادات اور بغاوت کا ایسا دروازہ کھول دیا ہے کہ کانگریس پر بھی اس سے بڑھ کر الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ ہم اورنگ زیب کو بُرا بھلا کہلوا کر اور سکول کے کورسوں میں اس کی مذمت لکھوا کر ہندوستان کے ماضی کو مٹا رہے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہندوستان کا بے حد چالاک پنڈت اسی ذریعہ سے اپنے لئے ایک شاندار مستقبل تیار کر رہا ہے اور برطانیہ کی ہندوستانی حکومت کے عین دل پر اسی طرح ایک خنجر مار رہا ہے جس طرح سیواجی نے افضل خان کے دل پر خنجر مارا تھا۔ سچ ہے چاہ کن را چاہ درپیش۔

مسلمانوں کا گورنمنٹ سے مطالبہ

اورنگ زیب کا بدلہ حکومت برطانیہ نے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے بدلہ لیا اور بہت عبرتناک طور پر لیا۔ یعنی سیواجی کو بھگت سنگھ کے بھیس میں کھڑا کر کے حکومت سے اس کے رویہ کی مذمت کروا دی اور اس کی پالیسی کی غلطی کا اس سے اعتراف کروا لیا۔ لیکن مسلمانوں کا حق ابھی موجود ہے وہ حق رکھتے ہیں کہ حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ یا تو اورنگ زیب اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کے خلاف بے معنی پروپیگنڈا کو بند کروایا جائے کہ جو اول انگریزوں نے شروع کیا اور اب اسے مہاسبھائی ذہنیت کے ہندو جاری رکھے جا رہے ہیں۔ یا پھر مسلمان یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ حکومت کے نزدیک بھگت سنگھ کا یہ فعل بھی قابلِ تحسین ہے۔ اور اگر بعض لوگ اپنی اولادوں کے دلوں میں اس نیک فعل کی یاد تازہ رکھنے کے لئے بھگت سنگھ کی برسی منایا کریں تو یقیناً مسلمان ان سے ہمدردی رکھیں گے۔ لیکن کیا حکومت اس فعل کو جائز رکھے گی؟

سیواجی اور بھگت سنگھ دونوں قاتل اور باغی تھے

قتل اور بغاوت بہرحال قتل اور بغاوت ہیں خواہ گورنمنٹ

آف انڈیا کی طرف سے انہیں برکت حاصل ہو یا کانگریس کی طرف سے۔ ہم تو بااصول آدمی ہیں ہم تو سیواجی اور بھگت سنگھ دونوں کو قاتل اور باغی سمجھتے ہیں اور دونوں کے فعل کو قابلِ ملامت خیال کرتے ہیں اور انگریزی حکومت کو سیواجی کی پشت پناہی اور کانگریس کو بھگت سنگھ کی تائید کے لئے یکساں مجرم خیال کرتے ہیں۔ ان دونوں نے ملک کے اخلاق بگاڑ دیئے ہیں اور دونوں خدا اور مخلوق کے سامنے جواب دہ ہیں۔ کاش گورنمنٹ سیواجی کی حمایت اور اورنگ زیب کی مذمت کر کے بھگت سنگھ پیدا نہ کرتی اور کانگریس بھگت سنگھ کی تائید کر کے آئندہ نسلوں کے قاتل اور غارت گر بننے کے لئے راستہ نہ کھولتی۔

ایک آریہ اخبار اور اورنگ زیب

ایک آریہ اخبار اپنی عادی ناسمجھی سے کام لے کر میرے خطبہ کے اس حصہ کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو قید کیا اس کی تائید کس طرح کی جاسکتی ہے۔ گویا سیواجی اس کے خیال میں اس لئے قابلِ تعریف ہے کہ اس نے اورنگ زیب کا مقابلہ اس کے اپنے باپ سے بغاوت کرنے کے سبب سے کیا تھا لیکن یہ درست نہیں۔ سیواجی خود ہی اپنے والد کا فرمانبردار نہ تھا وہ اورنگ زیب کے خلاف اس لئے کیونکر کھڑا ہو سکتا تھا اور اگر اس کے اس طرح کھڑے ہونے کی یہی وجہ تھی تو اس نے حاجیوں کو لوٹنے کا ارتکاب کس جُرم کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا تھا اور اگر یہ درست ہے کہ سیواجی اس لئے بغاوت پر آمادہ ہوا تھا کہ شاہ جہان کا بدلہ لے تو جہانگیر اور شاہ جہان کے اس قسم کے فعل کا مقابلہ کرنے کے لئے کون سا ہندو سورما کھڑا ہوا تھا۔

مُغل شہزادوں کی بغاوت کی وجہ

اصل بات یہ ہے کہ مُغل شہزادوں کی بغاوت جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے ہندو راجاؤں کی ریشہ دوانی کی وجہ سے تھی۔ ہر مغل شہزادہ جو بغاوت پر آمادہ ہوا وہ ہندو راجاؤں کی مخفی تائید رکھتا تھا۔ پس یہ بغاوتیں درحقیقت ہندوؤں کی چالاکیوں سے اور اسلامی حکومت کی تباہی کی غرض سے ہوئی تھیں اور شاہزادوں کا یہ قصور تھا کہ وہ اپنے ہندو مشیروں کے فریب میں آگئے اور ان کی چکنی چُپڑی باتوں کو انہوں نے قبول کر لیا۔ صرف اورنگ زیب ہی ایک مغل شہزادہ تھا جس نے اپنے بھائیوں کا مقابلہ اصول کے ماتحت کیا۔ یعنی اس نے صرف اس وجہ سے اپنے بھائیوں سے جنگ کی کہ وہ ہندو اثر سے متأثر ہو کر جن اصول پر اُس وقت حکومت کی بنیاد قائم تھی انہی

کو توڑنے لگے تھے۔ پس اورنگ زیب نے اس وقت کی کانسٹی ٹیوشن کی تائید کی اس وجہ سے وہ باغی نہ تھا بلکہ اس کا مقابلہ کرنے والے باغی تھے اور اس کے خلاف لکھنے والے آریہ مصنف صرف اس وجہ سے اس کے خلاف لکھتے ہیں کہ اس نے ان کی سازشوں کو تباہ کر دیا اور دوسرے مغل بادشاہوں کے خلاف اس لئے نہیں لکھتے کہ وہ خود ہندو راجاؤں کا آلہ کار تھے۔

ہندو ریاستوں کے صریح مظالم

اگر آریہ اخبارات سیواجی کی اس لئے تعریف کرتے ہیں کہ اس نے ظالم حکومت کا مقابلہ کیا تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ صریح ظلم جو اس وقت بہت سی ہندو ریاستوں میں ہو رہا ہے کیا وہ پسند کریں گے کہ مسلمان بھی سیواجی کی اتباع کر کے اسی کے اصول کو اختیار کر کے ان ریاستوں کے حکّام سے وہی معاملہ کریں جو سیواجی نے اورنگ زیب اور اس کے جرنیل افضل خان سے کیا تھا اگر وہ بااصول ہیں اور محض شرارت سے سیواجی کی تعریف نہیں کرتے تو میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ اس امر کا کھلے طور پر اعلان کریں کہ سیواجی نے جو کچھ کیا وہ درست تھا اور ویسا ہی معاملہ کرنا ہر اس شخص کے لئے جائز ہے جو خیال کرتا ہو کہ حکومت ظلم کر رہی ہے اور پھر وہ تمام لوگ جو بعض ہندو ریاستوں کے ان شدید مظالم کا جواب دینے کے لئے سیواجی کے اصول پر کھڑے ہوں ان کی تائید کریں اور سیواجی کی طرح ان کی بھی عزت قائم کریں۔ تب بے شک میں سمجھوں گا کہ ان کا یہ فعل شرافت پر مبنی ہے۔

آریہ اخبارات اور بھگت سنگھ

میں ان آریہ اخبارات سے یہ بھی پوچھتا ہوں کہ اگر سیواجی کا فعل درست تھا تو کیوں وہ بھگت سنگھ کی کھلے طور پر تعریف نہیں کرتے۔ اس کے معاملہ میں وہ یا تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس نے حکومت کے خلاف قتل کا کوئی ارادہ ہی نہیں کیا اور یا پھر یہ کہتے ہیں کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا یہ فعل بُرا تھا گو نیت نیک تھی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ سیواجی کی تعریف جھوٹے طور پر کرتے ہیں اور یا پھر وہ بھگت سنگھ کے فعل کو بُرا قرار دیتے ہیں تو منافقت سے کام لیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں سے باہر اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر اور کوئی صورت ممکن ہے تو وہ اسے پیش کریں۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ گالیاں دینا اور بات ہے لیکن دلائل سے وہ ان دو صورتوں کے سوا کوئی تیسری صورت ثابت نہیں کر سکتے۔ پس آریہ یقیناً یا تو سیواجی کی تعریف کرنے میں منافقت سے کام لے رہے ہیں یا بھگت سنگھ کے فعل کو بُرا قرار

دیتے ہیں۔ لیکن حق یہی ہے کہ دوسرے فعل میں وہ منافقت سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اورنگ زیب زندہ نہیں لیکن حکومتِ ہند باوجود خودکشی کی پالیسی اختیار کرنے کے پھر بھی انہیں سزا دینے کے قابل ہے اور آریوں کا سیواجی اور بھگت سنگھ کے متعلق متضاد رویہ محض ڈر سے ہے نہ کسی اصل کی پابندی کی وجہ سے لیکن ہر شریف آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریق کیسا گندہ اور کیسا مکروہ ہے۔

اب میں اپنا نقطۂ نگاہ بیان کر چکا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ حکومت اور آریہ جو بھی میرے مضامین کے متعلق کوئی قدم اٹھانا چاہے اس کو اچھی طرح سمجھ لے تا بعد میں انہیں ندامت نہ اٹھانی پڑے اور آریہ صاحبان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ خواہ کس قدر بھی گالیاں دیں اس سے ہمیں نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ جس بنیاد پر میں نے اپنے دعویٰ کو رکھا ہے وہ نہایت مضبوط ہے اور آریہ باوجود پورا زور لگانے کے اس کو ردّ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

الفضل کو تنبیہہ

میرا کام واضح ہے۔ ہمارے سلسلہ کے بانی کا احترام ہماری نظر میں اس سے ذرہ بھر بھی کم نہیں جس قدر کہ سناتن دھرمیوں کے دل میں کرشن جی اور رام چندر جی کا احترام ہے اور مسیحیوں کے نزدیک حضرت مسیح کا۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی عزت کی حفاظت کے لئے پورا زور لگائیں۔ میں کسی صورت میں خلافِ اخلاق اور جھوٹ پر مشتمل مضمون کی اجازت نہیں دوں گا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک مضمون پر میں الفضل کو تنبیہہ کر چکا ہوں۔

گورنمنٹ اور آریہ اپنا رویہ بدلیں!

لیکن جب تک کہ حکومت آریوں کو اس گندے الزام کے لگانے سے جو وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر لگاتے ہیں نہیں روکے گی میں اور جماعت احمدیہ ہرگز دوسری جماعتوں کے بزرگوں کا ادب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ بزرگوں کا احترام ایک سودا ہوتا ہے اور اس کی قیمت دونوں فریق کے لئے ادا کرنی ضروری ہے۔ پس ہم برابر ایسے سامان پیدا کرتے چلے جائیں گے کہ جن کی وجہ سے ایک طرف حکومت مجبور ہو کر اپنے رویہ کو بدلے اور دوسری طرف آریہ لوگ بھی مجبور ہوں کہ اخلاق کے معنی سیکھیں اور اخلاقی تعلیم پر عمل کریں۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو اسے چاہئے کہ آئندہ کے لئے

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمانوں کے دوسرے بزرگوں اور بادشاہوں کی عزت کی حفاظت کرے۔ اس کے بعد اگر ہم کوئی تحریر ایسی شائع کریں کہ جس میں آریوں یا کسی اور قوم کے بزرگ کی ذاتی ہتک ہو تو بے شک ہم قانونی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی مجرم ہوں گے لیکن اس سے پہلے نہیں اور ہرگز نہیں۔

مضمون کا دوسرا حصہ

میرے مضمون کا ایک حصہ ابھی باقی ہے اور وہ اُن غلط فہمیوں کے متعلق ہے جو میرے خطبہ سے خود احمدی جماعت یا دوسرے مسلمانوں کو پیدا ہوتی ہیں میں اس کے متعلق کچھ دوسرے مضمون میں بیان کروں گا لیکن سرِدست تو آشوبِ چشم کی وجہ سے یہ مضمون بھی میں نے تکلیف سے لکھا ہے اور کئی دن میں جاکر ختم کیا ہے۔

(الفضل ۲۸۔ مئی ۱۹۳۱ء)